اقبال اور آج کا پاکستان

محمد خالد مسعود

چند سال پہلے امرتا پریتم نے وارث شاہ کو دہائی دی تھی۔

اج اکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
اج فیر کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

جی میں آتا ہے کہ امرتا پریتم کی طرح آج میں بھی اقبال دردمند تک اپنی نوائے غم آلود پہنچاؤں اور مغل شہنشاہ کی مسجد کے زیر سایہ آرمگاہ میں خوابیدہ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے پیام بر شاعر مشرق سے کہوں کہ اٹھ اور اپنے پاکستان کو دیکھ۔ آج اس مملکت خدا داد میں غموں کے سائے پھیل رہے ہیں۔ مایوسیوں کے اندھیرے بڑھتے آ رہے ہیں، شہر خاموش ہیں، قصبوں پر سکوت طاری ہے۔ بچے خوف زدہ ہیں۔ بڑے طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا، عبادت گزاری سنگینوں کے پہروں کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ مسجدیں، امام بارگاہیں، مدرسے، سکول اور یونیورسٹیاں نفرت و انتقام کی بارود سے لہولہو ہیں تو ہسپتالوں اور بازاروں میں عفت مآب خواتین اور معصوم بچوں کی لاشیں بکھری ہیں۔ نہ نمازی محفوظ ہیں، نہ امام، نہ عورتیں مامون ہیں نہ بچے نہ بزرگ، نہ قبروں کو اماں ہے نہ مدفونوں کو۔

ایسا کیوں ہے؟

جی چاہتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے محرم راز سے پوچھوں کہ ایسا کیوں ہے کہ باسٹھ برس گزرے وطن کی جستجو میں جو کاروان جادہ پیما ہوا تھا وہ آج بھی خون کی ندیاں تیر رہا ہے۔ ضرب کلیم کے پیام بر سے سوال کروں کہ آج کا فرعون تیری ضرب کلیم سے کیوں خوف زدہ نہیں۔ خودی کی بلندی خودغرضی کی پستی میں کیوں ڈھونڈی جا رہی ہے۔ اس قدسی الاصل کی نظر اب صرف رفعت اقتدار کی طرف

کیوں ہے تا کہ ہر انقلاب سے پہلے خدا نے سیاست ان سے ان کی رضا پوچھے۔ بندگان پر تقصیر کو ابھی تک وعدہ حور کا گلہ کیوں ہے۔ اغیار کے قصور وظہور پہ شکایات کیوں ہیں۔ اغیار و کفار کے ایوانوں پر رحمتوں سے ملول کیوں ہیں اور مسلمانوں کے کاشانوں پر برق کی خیرہ گری ہمارے یقین، نظم اور اتحاد کو کیوں پارہ پارہ کر دیتی ہے۔

جی چاہتا ہے اقبال حق شناس سے پوچھوں کہ اب تو اس مملکت خداداد کی فضائیں پانچوں وقت اذان کی آوازوں سے گونجتی ہیں، نمازیوں کی وہ کثرت ہے کہ مسجدیں کم پڑ رہی ہیں، فرقہ واریت کی خون آشامی اور دہشت گردی کے باوجود مسجدوں کی رونق میں کمی نہیں آئی ہے۔ پھر بھی اس کشور حسیں کی مسجدیں کیوں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔ اب تو احترام رمضان نے قانونی اور شرعی روزہ داروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ اب آئین وفاداری سے گریز کا الزام کیوں۔ ہم تو پہلے ہی اس بات کے قائل تھے کہ قوم مذہب سے ہے۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ مذہب نہیں تو ہم بھی نہیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ ملت رسول ہاشمی اپنی ترکیب میں خاص ہے کہ اس کا جذب باہم مذہب سے ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ یہ جذب باہم فرقہ واریت اور مسلکی عصبیت میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ مسلک سے باہر کیوں کارفرما نہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ یہ جذب باہم نفرت اور عناد کے سوا کسی جذبے کی آبیاری نہیں کرتا۔ ایسا کیوں ہے کہ اس جذب باہم نے برخرمن کو برق آسودہ بنا دیا ہے، آبا پرستی کو شعار بنا دیا ہے اور اسلاف کے مدفنوں کی مجاوری کو پیشہ۔ ایسا کیوں ہے کہ اس جذب باہم کو پروانے نشیمن نہیں رہی۔

جی چاہتا ہے کہ اقبال فردا بیں سے پوچھوں کہ ہم آزاد ہو کر بھی خود کو غلام سمجھنے پر کیوں مصر ہیں۔ محکومیت سے ہمارا رشتہ اتنا اٹوٹ کیوں ہے۔ ہم حاکموں کے انتظار میں کیوں رہتے ہیں۔ ہم نت نئے آقاؤں کی تلاش میں ہاتھ پر ہاتھ کیوں دھرے بیٹھے ہیں۔ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے کیوں خوف زدہ ہیں۔ ہمیں خود پر بھروسہ کیوں نہیں۔ ہم اپنی تاریخ پر نادم کیوں ہیں ہم اپنے جغرافیے سے شرمندہ کیوں ہیں۔ ہم اپنے آبا سے شاکی کیوں ہیں۔ ہم اپنی ہی زمین سے وفا پیمائی میں متذبذب کیوں ہیں، ہم اپنا مستقبل ماضی میں تلاش تو کرتے ہیں لیکن ہم میں سے ہر ایک اس ماضی کی نئی تاریخ کیوں رقم کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے امیر مالمست اور ہمارے فقیر حال مست کیوں رہتے ہیں۔ خواجہ روز بروز بلند بام کیوں ہوتا جاتا ہے اور کوچہ گردی بندہ کا مقدر کیوں ہے۔ رند و فقیہ اور میر و پیر سب خلق خدا کی گھات میں کیوں رہتے ہیں۔

شریعت محمدی کے سوختہ ساماں پروانے ذوق خود افروزی میں خودکشی کو شیوہ کیوں بنا بیٹھے ہیں۔ ایک وعدہ حور پر جنت ارضی کو جہنم بنانے پر کیوں تلے ہیں۔ چراغ مصطفوی کے پروانے دنیا بھر کو بولہبی کی آگ سے کیوں جھلس رہے ہیں۔ غیوری اور خودداری کی

داستانیں کیوں فسانہ ہوگئی ہیں لوگ اخوت سے گریزاں کیوں ہیں۔آپس میں غضبناک خطابیں اور درپے آزار کیوں ہیں۔

ہمارے واعظ سراپا گفتار اور شعلہ مقال کیوں ہو گئے ہیں، ہمارے ناصح فرقہ بندی اور کافرگری کی دھن میں تارک آئین رسول مختار کیوں ہوتے جارہے ہیں۔ پوری ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن کیوں ہے۔ارض پاک کی حرمت پر کٹ مرنے والے نفرت کی فصل کیوں کاٹ رہے ہیں۔ایسا کیوں ہے کہ ہمارے واعظ سراپا گفتار اور شعلہ مقال کیوں ہو گئے ہیں، ہمارے ناصح فرقہ بندی اور کافرگری کی دھن میں تارک آئین رسول مختار کیوں ہوتے جارہے ہیں۔ پوری ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن کیوں ہے۔ارض پاک کی حرمت پر کٹ مرنے والے نفرت کی فصل کیوں کاٹ رہے ہیں۔ایسا کیوں ہے کہ ہمارے قلب سوز سے محروم ہیں اور ہماری روح زیاں کار اور سود فراموش ہے۔بلبل کے نالے بھی اس کی خاموشی کے سکوت مرگ کو کیوں نہیں توڑتے۔

کہیں ایسا تو نہیں

پھر سوچتا ہوں کہ میں کہیں عجلت پسند تو نہیں، میں بے صبری کا اظہار تو نہیں کر رہا۔قومیں تو کرب و بلا کے امتحانوں سے گزرتی ہی رہتی ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری درس گاہوں نے سچ اور سوچ کا گلا گھونٹ دیا ہے۔سکولوں میں دونی دونی کے پہاڑوں کے شور میں، مدرسوں میں ضرب یضرب کی گردانوں کی تکرار میں اور خانقاہوں میں اللہ ہو کی ضربوں کی گونج میں لا الہ الا اللہ کی صدا سنائی نہیں دے رہی۔کہیں ایسا تو نہیں کہ زندگی اندیشہ سود و زیان سے برتر ہے۔اسے پیمانہ روز و فرداسے نہیں ناپا جاسکتا۔گردش صبح و شام کو زمان کا نام نہیں دیا جاسکتا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ زندگی تو جاوداں ہے، پیہم دواں ہے۔زندگی تو سرآدم ہے ضمیر کن فکاں ہے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ زندگی کا جوہر عشق ہے اور عشق کا جوہر خودی۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جب تک عشق گرہ کشا کا فیض عام نہ ہو دانش و دیں اور علم و فن تمام کے تمام بندگی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آج قیس حجاب رخ لیلیٰ کا طالب ہے کہ اب اس میں زحمت کشی تنہائی صحرا کی تاب نہیں رہی۔شہر کی ہوا کیا لگی کہ اب بادیہ پیائی قیس کے بس کی بات نہیں رہی وہ گلہ جور اور شکوہ بیداد کے طعنے نہیں سن سکتا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ قیس لیلی کو دنیا کی تمام زحمتوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔وہ لیلی کے عشق میں کبھی سکولوں پر تالے لگا تا ہے، کبھی دفتروں کے دروازے بند کرتا ہے کبھی مینا بازار زیروزبر کرتا ہے کبھی ہسپتالوں کو نذر آتش کرتا ہے۔اس کی برق غیرت ہر خرمن کو جلائے دیتی ہے کوئی صحرا کوئی گلشن ایمن نہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم محکومیت پسندی کیا آرام طلبی کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ خود حاکمیت کے تصور سے بھی ہول آتا ہے۔

مردِ غیب کے انتظار میں خود انضباطی کے خیال سے بھی ڈرتے ہیں۔ ہماری یہ محکومیت پسندی کہیں کاہلی کا بہانہ تو نہیں۔ حاکمیت کی نا اہلی کا اعتراف تو نہیں۔ اعتذار کی عادت تو نہیں، خودداری اور خود اختیاری سے فرار تو نہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ غلامی نے فطرت کو اس قدر پست کر دیا ہے کہ ہم آزادی کو مجبوری کا نام دے رہے ہیں اور اپنے شعلہ سوز اں کو دود قرار دے رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو قوم اپنی خودی سے انصاف نہ کرے محکومی اور مظلومی اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ قانون فطرت افراد سے تو اغماض کر لیتا ہے لیکن ملت کے گناہوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ زندہ قومیں اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ محکومیت اور بندگی کا احساس زندگی کو گھٹا کر جوئے کم آب بنا ڈالتا ہے۔ آزادی کا یقین ہو تو یہی زندگی بحر بے کراں ہو جاتی ہے۔ آزادی پر ایمان ہو تو انسان مستعار زمین و آسمان کو پھونک کر ان کی خاکستر سے اپنے لیے نیا جہان پیدا کر لیتا ہے لیکن محکومیت کی دنیا میں عقل بے زمام رہتی ہے اور عشق بے مقام۔

اقبال سے معذرت

اقبال سے معذرت کہ ہم پر خود فریبی کی نیند طاری ہے اس کی بانگ دارا اس قافلے کو بیدار نہیں کر پا رہی۔ اس کی بالِ جبریل ہمارے انفس و آفاق میں کہیں گم ہو گئی ہے۔ اب کے پر تو موجود ہیں لیکن طاقت پرواز نہیں رہی۔ یہ فریب خوردہ شاہین اب چٹانوں سے اتر آیا ہے۔ طائر لاہوتی کی نگاہ دور بین کمزور ہو چکی ہے۔ اب کسی بھی رزق سے نہ موت کا ڈر ہے نہ پرواز میں کوتاہی کا خوف۔ ارمغان حجاز میں نہ نغمہ ہندی سنائی دیتا ہے نہ حجازی لے۔ نہ عرب ہمارا رہا ہے نہ چین۔ ہم توحید کی امانت سینوں میں لیے منتظر فردا نے امریکہ ہیں۔ اس امید پر کہ امریکی تہذیب ایک نہ ایک دن اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی ہمارا سیل رواں پاسپورٹ بدست مغرب کی وادیوں میں اذان کے لیے بے تاب ہے۔ ہمارے گو امریکہ گو کے نعروں میں امریکہ چلو کسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ گرین کارڈ کی تمنا بار بار لب پہ دعا بن کے آتی ہے۔

میں اقبال سے معافی مانگنا چاہتا ہوں کہ نہ اب میرا نالہ بے باک رہا ہے نہ اس میں آسماں چیرنے کی ہمت ہے۔ میرے شکووں پر نہ گردوں توجہ دیتا ہے، نہ چاند اور ستارے اب تو اس جنت سے نکالے کو نہ رضواں پہچانتا ہے نہ فرشتے۔ ان کے تبسم ہائے پنہائی سے طنز نمایاں ہے کہ اس مسجود ملائک کو خلافت راس نہیں آئی۔ یہ بھی مخلوق قدیم کی طرح خون خوار اور فسادی بن گیا۔ خاک کی چٹکی میں آگ اور بارود کا خمیر شامل ہو چکا ہے۔ عجز کے اسرار سے نامحرم مٹی کا یہ پتلا اپنی طاقت گفتگو سے خود ہی مسحور ہو چکا ہے۔ نعروں کی توپوں کی گھن گرج میں سرمست، خودکشی کی بے خودی میں مخمور، خلافت ارضی کا یہ وارث نفرت اور تکفیر کے ہتھیاروں سے فتح عالم پر

مصر ہے۔

ہمارے خطیب اور مقرر تیرے اشعار سے تقریر میں جوش تو پیدا کرتے ہیں لیکن گرمی اندیشہ افکار کے قائل نہیں رہے۔ تیرے پیغام کو اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کی چھینا جھپٹی میں اقبال تقسیم در تقسیم ہو گیا ہے۔ اشعار کا رشتہ پیغام سے کٹ گیا ہے۔ اقبال کے ہر دعویدار نے الگ سے اپنا اقبال تخلیق کر لیا ہے۔ رجعت پسندوں کا اقبال الگ ہے، ترقی پسندوں کا الگ، جمہوریت پسندوں کا اقبال الگ ہے، ملوکیت پسندوں کا الگ، صوفیا کا اقبال الگ ہے فقہاء کا الگ، غزل کا اقبال الگ ہے، نظم کا الگ، اردو کا اقبال الگ ہے، فارسی اور انگریزی کا الگ۔ یوں اقبال ہر دلعزیز تو ہو گیا ہے لیکن اتنے سارے اقبالوں میں یہ ڈھونڈنا مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ میرا اقبال کون ہے۔ آج میں اس کنفیوژن پر اقبال سے بے حد شرمندہ ہوں۔